اقبالؒ سے عطاؒ تک

عنایت اللہ گنڈہ پور

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

رفت چوں اقبال از دارِ محن — رفت با اقبال، اقبالِ سخن

روح او بخشید ایں خدمت بمن — تا نمیرد بعدِ اُو ایں پاک فن

گُفت زیں میخانہ دل برداشتم — بادہَ باقی بتو بگذاشتم

من ہمی دانم حریفش نیستم — ہمدم و ہمداستانش نیستم

لیک ایں خدمت بجاں کردم قبول

تا نگردد شاعرِ خاور ملول

عطاءُ اللہ خان عطا

www.iqbalcyberlibrary.net All rights reserved ©2002-2006

ماد رپسِ گرامی و اقبال آمدیم
بر عارضِ عروسِ سخن خال آمدیم

یہ پاکستان کے ایک ایسے گمنام صاحبِ دیوان فارسی شاعر کا دعویٰ ہے جس نے ۱۵ سال کی عمر میں فارسی زبان میں شعر کہنا شروع کیا۔ تا دمِ تحریر ۹۰ سال کے ہو چکے ہیں۔ ان کا مجموعۂ کلام "کلیاتِ عطا" حصہ اول، دوم، سوم اور چہارم بعنوان "امان نامہ" شائع ہو چکے ہیں۔
عطا ءاللہ خاں عطاؔ جو ۱۸۹۸ / ۱۸۹۷ء میں بمقام ٹھکوارڑہ تحصیل کلاچی ڈیرہ اسمٰعیل خان، (صوبہ سرحد) قبیلہ گنڈہ پور کے ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابھی چھٹے درجے میں تعلیم پا رہے تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا لیکن والدہ نے صبر و شکر اور ہمت سے آپ کی تعلیم و تربیت کی نگہداشت کی۔ ابتدائی تعلیم سے فارغ ہوئے تو اسلامیہ کالج پشاور بھیجے گئے وہاں سے بی۔ اے کرنے کے بعد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے قانون کی ڈگری حاصل کی اور ڈیرہ اسمٰعیل خاں آ کر وکالت کا آزاد پیشہ اختیار کیا۔ تقریباً ۵۰ سال وکالت کی۔ ۱۹۷۰ء میں حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کرنے کے بعد وکالت کو خیرباد کہا اور ۱۹۷۶ء میں گومل یونیورسٹی ڈیرہ اسمٰعیل خاں کے قیام کے ساتھ ہی وہاں قانون کے پروفیسر و مشیر مقرر ہوئے اور گومل یونیورسٹی کا کیلنڈر تشکیل دیا۔ ۱۹۸۳ میں بوجہ ضعیف العمری درس و تدریس کا یہ سلسلہ ختم کرنا پڑا۔ اب ہمہ وقت یادِ الٰہی اور مدحِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم میں مگن رہتے ہیں۔
عطاء اللہ خاں عطاؔ ڈیرہ اسمٰعیل خاں کے ریگزار میں پیدا ہوئے۔ جو شخص ڈیرہ اسمٰعیل خاں نہیں

IqbalCyberLibrary
All rights reserved
2002-2006

گیا وہ اس علاقے کی کیفیت کا اندازہ نہیں کر سکتا۔ آپ خود اپنے وطن کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتے ہیں ؎

از سوادِ ڈیرہ اسماعیل خاں
خطۂ چوں تابۂ آہن تپاں
سرزمینِ بے گیاہ و سبزۂ
ابرگا، ہش سائباں ناگشتۂ
ریگزارش سوسماراں را وطن
طائرانش کرگس و زاغ و زغن

فارسی شاعری کی روایت اب ہمارے ادب سے معدوم ہو چکی ہے۔ دراصل اس برصغیر میں علامہ اقبال اس سلسلے کی آخری کڑی تھے۔ ان کے بعد یہ روایت دم توڑ گئی۔ ان کے بعد کوئی ایسا فارسی شاعر نظر نہیں آیا جس نے فارسی میں بھرپور شاعری کی ہو اور فارسی شاعری کی اس روایت کو جو سائنہ سے چلی آرہی تھی، مزید آگے بڑھایا ہو ــــ لیکن اس دعوے میں ایک استثنا ہے کہ جس کا بیان فارسی شاعری کی تاریخ میں لازمی ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ فارسی گوئی کی یہ تاریخ اس نام کے بغیر کسی طرح مکمل ہو سکے ــــ یہ نام عطا محمد خاں عطا کا ہے۔ جنہوں نے فارسی میں ایسی بھرپور شاعری کی ہے کہ اس عظیم روایت کے زعماء کی فہرست میں ان کی شمولیت ایک ناگزیر امر ہے۔ علامہ اقبال کے بعد ایسی بھرپور شاعری کہیں نظر نہیں آتی۔

اس دعوے کی دلیل کے طور پر میں یہ بتانا چاہوں گا کہ عطا صاحب نے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور وہ بھی اس خلوصِ دل سے کہ حق ادا کر دیا ہے۔ چنانچہ ان کے ضخیم دیوان میں حمد و مناجات، نعت و منقبت، قصیدہ و مرثیہ، غزل و مثنوی، غرضیکہ ہر صنف کے فراواں نمونے شامل ہیں۔ آپ نے ہر صنفِ شاعری کو اس خلوص سے برتا ہے کہ فارسی شاعری کی کلاسیکی اقدار دوبارہ زندہ ہو گئی ہیں۔ بلکہ بعض اصنافِ سخن مثلاً مثنوی میں پرانی روایات کو نئے امکانات سے روشناس کیا ہے۔

اس سے پہلے کہ عطا کی شاعری کے متعلق کچھ کہا جائے ان کی اپنی قوم سے مایوسی اور بددلی کا ذکر مناسب ہے۔

عطا کو اپنے اہلِ وطن سے شاعری کی طرف سے غفلت کا بے حد قلق ہے بلکہ ابنائے وطن کی

قدر ناشناسی اور فارسی بولنے والے علاقوں کی طرف ہجرت کی تمنا ان کے کلام میں جابجا نظر آتی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

زود بینی سوئے شیرازم سفر
در وطن شہرت مقدر نیستم
از قدر ناشناسیٔ اہلِ وطن بزدود
بینی کہ رختِ خویش بہ کابل کشیدہ ام
عطاؔ کہ در وطن تو سخن نمی ورزد
بیا کہ عازمِ شیراز و فاریاب شوم

گمنام شاعریست عطاؔ در دیارِ ما
رقصِ مسیح بر غزلِ ارجمند او

چنانچہ ان کے کلامِ ارجمند پر مسیحایانِ اہلِ زبان نے خوب خوب دادِ رقصِ مسرت دیا لیکن افسوس کا مقام ہے کہ اپنے اس بزرگ شاعر سے جس سے ایران تک متعارف ہے ہم خود اب تک بے بہرہ ہیں۔ ان کا کلام ایک سیلانی کی معرفت ایران پہنچا جہاں اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ چنانچہ تہران کے ایک علمی اور تحقیقی مجلے "وحید" شمارہ رمضان ۱۳۸۶ھ میں "پارسی گویانِ معاصرِ پاکستان" کے عنوان سے ایک مضمون چھپا جس میں صرف عطاء اللہ خان عطاؔ کا بحیثیت شاعر یہ کہہ کر تعارف کرایا گیا ہے:

"اینک شاعرِ بزرگ و برجستہ و جامع معاصر عطاء اللہ خان عطاؔ، بدوستدارانِ فارسی معرفی می گردد"۔

تاہم مضمون پڑھ کر اور کلام کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ "وحید" کا نقطۂ نظر محدود ہے اور عطاؔ کے کلام کا پورا احاطہ نہیں کرتا۔

عطاؔ کی شاعری کا رنگ و روپ اور آب و تاب کلاسیکی ہے۔ وہ الفاظ کے در و بست میں خاص احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ معانی، بدیع اور بیان کے علوم سے نراوں فائدہ حاصل کرتے ہیں۔ چنانچہ خود کہا کرتے ہیں:

"شاعری تو الفاظ کی رعایات ملحوظ رکھنے کے شعور کا نام ہے"۔

عطآ کے کلام میں یوں تو ہر صنفِ سخن بقدرِ وافر موجود ہے لیکن ان کے اصل میدان دو ہیں۔

اوّل : مثنوی

دوم : قصیدہ

اور یہی دو اصناف ہیں جن پر ان کے کلام کا زیادہ تر حصہ مشتمل ہے۔ مثنوی میں عطآ حکیم الامت علامہ اقبال کے متبع ہیں، چنانچہ بیشتر مثنویات ملک وملت ہی کے موضوعات سے بحث کرتی ہیں۔ اندازِ بیان میں اقبال کا اسلوب ولہجہ نمایاں ہے۔ عطآ کو نہ صرف خود اس بات کا اعتراف ہے بلکہ اس پر فخر ہے کہ وہ اقبال کی روایت کے وارث ہیں ؎

رفت چوں اقبالؔ از دارِ محن!
رفت با اقبالؔ، اقبالِ سخن
روحِ او بخشید ایں خدمت بمن!
تا نہ میرد بعدِ او ایں پاک فن

گفت زیں میخانہ دل برداشتم
بادۂ باقی بتو بگذاشتم!
من ہمے دانم حریفش نیستم
ہمدم و ہمداستانش نیستم

لیک ایں خدمت بجاں کردم قبول
تا نگردد شاعرِ خاور ملول

چنانچہ اس خدمت کی بجاآوری کے لیے یہ صنفِ سخن عطآ نے اختیار کی ہے اور تیس سے زائد مثنویاں اس امر پر شاہدِ عادل ہیں کہ انہوں نے اس خدمت کا حق ادا کر دیا ہے۔ ان کے موضوعات بھی بیشتر ملّی و وطنی ہیں۔ علامہ اقبال مرحوم نے اگر اسلام کی جدید زبان میں تشریح کا کارنامہ انجام دیا تھا تو عطاء اللہ خاں عطآ نے اسی تشریح کے پیشِ نظر مسلمانوں کے جدید معاشرتی اعمال کا جائزہ لیا ہے۔ اس لحاظ سے عطا کا کلام اقبال مرحوم کے کلام کا تتمہ کہلانے کا مستحق ہے۔ مثنوی "ملّا، پیر، خان" اور "مثنوی درحالاتِ ناہموار" اور "مکالمۂ ڈاکٹر اقبال وخودی" بین

www.IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006

نسبتاً طویل مثنویاں ہیں۔ ان کے علاوہ چالیس کے قریب مثنویاں اور ہیں جن کے اشعار کی تعداد پندرہ بیس سے لے کر ۸۰ یا ۱۰۰ تک پہنچتی ہے۔

"مثنوی در حالاتِ ناھموار"

ان سب میں سے زیادہ طویل ہے جو قریب قریب ۱۰۰ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس نظم پر علامہ اقبال کی نظم "خضرِ راہ" کا اثر بہت نمایاں ہے۔ اقبال مرحوم کی طرح شاعر اپنے گرد و پیش کے حالات سے نہایت بے اطمینانی محسوس کرتا ہے اور حدودِ ہائے دہنو سے باہر ایسی جگہ پہنچتا ہے جہاں انسان اور اس کی حسرتوں کا گذر نہیں۔ چنانچہ وہاں ایک بزرگ خرقہ پوش نمودار ہوتے ہیں جن سے شاعر اپنے اضطراب کا حال بیان کرتا ہے اور چند سوالات کرتا ہے۔ ان سوالات کے جواب میں وہ خرقہ پوش وہ سب کچھ کہتا ہے جو اصلاً شاعر خود کہنا چاہتا ہے اور اس طرح یہ نظم گھلنا شروع ہوتی ہے تا آنکہ شاعر سوالوں کی صورت میں ہمارے معاشرے کے ناسوروں کی نشاندہی کرتا ہے اور خرقہ پوش ان کے علاج تجویز کرتا ہے۔

مثنوی "ملا" "پیر" "خان"

دوسری بڑی مثنوی ہے۔ اس مثنوی میں مسلمانوں کی اس حالت کا جائزہ لیا گیا ہے جو برصغیر پاک و ہند میں دو صد سالہ غلامی نے پیدا کر دی تھی۔ عطا اس پسماندگی اور انحطاط کا باعث قوم کے اندر تین عناصر کو قرار دیتے ہیں جو بالترتیب :

علمی شعبہ میں "ملا"؛

روحانی شعبہ میں "پیر"؛ اور

معاشرتی شعبہ میں "خان" (وڈیرا۔ جاگیردار) ہے!

مکالمہ ڈاکٹر اقبال و خودی

اس مثنوی میں ڈاکٹر اقبال خودی سے پوچھتے ہیں کہ — "بتا! میرے چلے جانے کے بعد تیرا اس ملک میں کیا حال ہے؟"

اس پر خودی عرضِ حال کرتی ہے اور کہتی ہے

ے

من ز پاکستاں ازاں بگریختم
کاندرو دانش نیست باقی طالبم

اہلِ پاکستاں حریفم نیستند
ہمدم و ہمداستانم نیستند
از کراچی تا پشاور رفتہ ام
شہر شہر و قریہ قریہ دیدہ ام
از سوادِ ایں وطن آزردہ ام
ہر کجا رفتم ہزیمت خوردہ ام

چنانچہ خودی اپنا حالِ زار سناتی ہے اور کہتی ہے کہ بس میں تو اس دیار میں یکہ و تنہا رہ گئی ہوں۔ میرا صرف ایک ہمنوا عطاء اللہ خان رہ گیا ہے ؎

شاعرے باقی عطاء اللہ نام
از مے من جرعۂ دارد بجام

عطاء اللہ خان عطاؔ کے کلام کا ایک بڑا حصہ حمد و مناجات اور نعت و منقبت پر مشتمل ہے صرف ان کا نعتیہ کلام تقریباً ۸۰۰ اشعار پر مشتمل ہے۔ چند ایک نقل کرتا ہوں ؎

سایہ را از مہر پنہاں داشتی
بر سرِ ما تا بہ محشر افگنی

تا سایہ ات بخاک نیفتد از اں کشید
چتر ے بہ سرو قامتِ بالائے تو سحاب
یا آفتاب تابِ جمالِ رخت نداشت
بر روئے خود ردائے ابر کشید از پئے حجاب

قلم را گہے نوک نشگافتہ
قمر را دو پیکر بہ بیند افتہ

چہ شد گر بچشمِ جہاں بے نوائیم
بعشقِ محمد رقیبِ خدائیم

قلم بدستِ من از فرطِ شوق می رقصد
بود چو نعتِ محمد نوشتنم مقصود

من نعتِ خواجۂ دوسرا گفتہ ام عطاؔ
باید بہ زر نوشت حروفِ بیانِ ما

فصیحانِ عرب یک یک بہ پیشش می تپیدہ
نفس گم کردہ می آمد قدم لرزیدہ لرزیدہ

کلامش را پس از قرآں کلام اللہ می دانم
کلامش را چوں قرآں می نہم بر دیدہ بر دیدہ

عطاؔ عشقِ رسولؐ سے سرشار ہیں اور یہی عشقِ رسولؐ ان کے کلام کا روحِ رواں ہے۔ کلام کسی عنوان سے بھی شروع ہو اس کی تان اکثر و بیشتر اسی محبوب موضوع پہ آ کر ٹوٹتی ہے۔ اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اگر یہ محبت ایک طرف عطاؔ کے رگ و پے میں ساری ہے تو دوسری طرف کلام میں بھی جاری ہے۔ یہی والہانہ شیفتگی نعتیہ کلام کو عام قصیدہ گوئی سے جدا کرتی ہے۔ نعت ہی کے موضوع نے عطاؔ کو قصیدہ گوئی میں کمال عطا کیا ہے۔ چنانچہ ان کے نعتیہ قصیدے نہایت فخر سے اکابر شعرائے فارسی کے قصائد کے برابر رکھے جا سکتے ہیں۔ انہوں نے نعتیہ قصائد کے علاوہ بعض قصائد اصحابِ رسولؐ اور اکابر صوفیا کی شان میں بھی لکھے ہیں۔ اس سلسلہ میں شاعر کی نگاہ صرف ماضی پر نہیں رہتی بلکہ حال کے بزرگانِ ملت کی شخصیتوں کا اعتراف بھی نہایت فخر سے کرتے ہیں۔ چنانچہ علامہ اقبال مرحوم کی مدح میں جو قصیدہ لکھا ہے اس کے چند اشعار خالی از دلچسپی نہ ہوں گے ؎

اے حکیمِ ملت و اے شاعرِ معجز بیاں
اے کہ نامِ با کمالِ تُست وردِ ہر زباں
بہرِ دورِ حاضرت خوانم کہ بالاتر ازاں
طوطیِ شکّر فشاں یا ماہیِ بحرِ بیاں

گرمیِ بزمِ سخن از مشعلِ افکارِ تست
اے کہ از نورِ کلام تست روشن چشم و جاں
باہم الفاظ و معانی ہمچو نرمی در حریر
یا تپش در آتش و یا بو بہ گل اندر نہاں
چوں تو رفتی فارسی از ملکِ ما معدوم شد
فارسی را جز عطا باقی نہ بینم قدرداں

اسی طرح سید عطاء اللہ شاہ بخاری مرحوم کا قصیدہ جو ان کے حیاتِ حیات میں لکھا گیا تھا، معاصرانہ اعترافِ کمال کا کامل نمونہ ہے۔ چند اشعار درجِ ذیل ہیں ؎

تُو اے غواصِ دریائے معانی
تُو اے سحر البیانِ الف ثانی
بخاری، سیّدی، قاری، خطیبی
ادیبی، فاضلی، جادو بیانی
برآری از دلِ خارا نفیرے
بہ ترتیلے کہ تُو قرآں خوانی
کشی تصویرِ احساساتِ قلبی
بہ تقریرے کہ صورتہائے مانی
عطا کم دیدہ ام نظم و قصائد
بدیں خوبی و معنی و روانی!

قصائد کا ذکر نامکمل رہے گا اگر عطا کے مراثی کا بھی ذکر نہ کیا جائے کیونکہ اصولی طور پر مرثیہ بھی قصیدہ ہوتا ہے جو کسی شخص کے مرنے کے بعد لکھا جاتا ہے۔ ان مراثی میں قابلِ ذکر مراثی جگر مراد آبادی، میر انیس، مرزا دبیر، عبدالرب نشتر اور عطاء اللہ شاہ بخاری کے ہیں جن سے شاعر کی شدتِ احساس اور گدازِ قلب کا پتہ چلتا ہے۔ مرثیہ میر انیس سے چند اشعار پیش کرتا ہوں جو عطاؔ کی قادر الکلامی اور پختگیٔ سخن پر دلالت کرتے ہیں ؎

ز بحرِ فیضِ حسینؓ است یک جہاں سیراب
حسینؓ بر لبِ دریا نیافت جرعۂ آب

حسینؓ ملّتِ مرحوم را سبق آموخت
ہمیں کہ در رہِ حق جاں بدہ و جنّت یاب
انیسؔ در غمِ شبیرؓ اشکِ خوں می ریخت
زدیدہ شام و سحر پے بہ پے جو لعل مذاب
دِگر بہر ہیِ اشک خوں چکید بروں
زراہ دیدہ دِلش پارہ پارہ ہمچو عناب!
ز بسکہ خورد ز جامِ حسینؓ بادۂ عشق
بجائے شعر ز لب ریخت لولوئے شاداب
ز چوبِ طورِ قلم و ز حریر قرطاسش!
ز مُشکِ ناب سیاہی زہے چنیں آداب
چہ ممکن است کہ زاید دِگر چو میر انیسؔ!
ز بطنِ مادرِ ایام تا بہ یومِ حساب!

جگر مراد آبادی کی موت پر اس طرح آنسو بہاتے ہیں ؎

اے رفتہ سوئے گورِ غریباں چگونہٗ
دُور از جہاں بہ شہرِ خموشاں چگونہٗ
در ماتمِ تو انجمنے ساختیم ما
تنہا تو بے اقارب و یاراں چگونہٗ

قطعاتِ تاریخ کہنے میں بھی عطاء اللہ خاں عطاؔ کو ملکۂ خاص حاصل ہے۔ تاریخ گوئی کا فن اب رُو بہ زوال ہے اور بہت کم لوگ اس کی طرف توجہ دیتے ہیں۔ عطاؔ کی روایت کے ساتھ وفاداری کا یہ بھی ایک مظہر ہے کہ انہوں نے تاریخ گوئی میں نہ صرف دلچسپی لی ہے بلکہ اسے بکثرت استعمال میں لاکر گویا اس کی از سرِ نو ترویج کی طرف راہنمائی کی ہے۔ جگر مراد آبادی مرحوم کے ایک قطعۂ تاریخی میں سولہ تاریخیں نکالی ہیں اور تمام تاریخوں میں التزام یہ کیا ہے کہ ہر تاریخ کسی نہ کسی مشہور شاعر کے نام سے نسبت دے کر نکالی ہے۔ یہاں مثال کے طور پر قائدِ اعظم مرحوم کی تاریخِ وفات نقل کی جاتی ہے ؎

حق قائدِ اعظم را از دہر بہ جنت بُرد
صد آہ و فغاں برخاست از جملہ کلان و خُورد
تاریخِ وصالش شُد
آہ قائدِ اعظم مُرد

۱۳۶۷ ہجری

عطاءاللہ خاں عطاؔ کی غزل بھی مثنوی اور قصیدہ کی طرح جاذبِ دل و نگاہ ہے۔ غزل کے چند جستہ جستہ اشعار ملاحظہ فرمائیے ؎

خوں ببارید ے عطاؔ از ابرِ نیساں جائے آب!
ابرِ نیساں ہمچوں من گر دردِ ہجراں داشتے

ہر پریشانی کہ دل در بندِ زُلفش می کشد
مُو بمُو احوالِ آں بادِ صبا داند کہ چیست

ساقی تو اش بجامِ بلوریں مدہ شراب
از گُل پیالہ کُن کہ لبِ یار نازک است!

روزِ ازل کہ نامۂ انساں نوشتہ است
مضمونِ رنج و غم سرِ عنواں نوشتہ است

ہزاراں گل بروید از ریاضِ فکرِ من ہر دم
گلستانے کہ من دارم، بہارے بے خزاں دارد

عطاؔ چوں بر فلک شعرِ تو می خوانند، می گویند
بہ بیں ایں شاعرِ خاکی زبانِ قدسیاں دارد

چیزے کہ گوئی، نغز بگو، مختصر بگو
یک شعرِ ارجمند بہ دیواں برابر است:

فروعیات میں ایسے اشعار ملتے ہیں کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے ۔

کامیابی وجہِ شہرت نیست در اقلیمِ عشق!
کوہکن از نامرادی شہرتِ دائم گرفت

حسن و جمال است نہ محتاجِ خال
نقطہ نہ دارد کلمہ طیّبہ!

از گزندِ چشمِ بدخُو را نگاہدارند خلق
من زِ چشمِ خوب در فتنہ و بلا افتادہ ام

نداشت تابِ جمالش چو آفتاب عطاؔ
ز انفعال بہ رُخ چادرِ سحاب کشید

بُلبلاں را درونِ کُنجِ قفس!
زاغہا را بہ باغ می بینم!
بُلبلاں را بچشمِ خار عطاؔ!
گُل بہ منقارِ زاغ می بینم!

اگر شعرِ عطاؔ صد بار خوانی
تو گوئی بارِ اوّل خواندہ ام من

ظاہر نہ شد بہ ہیچ کسے رنگ و بوئے من
ما زندگی چو لالۂ صحرا گذاشتیم

www.IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved ©2002-2006

قومیکہ ہمہ دارد و جانباز ندارد
جانباز کہ جاں بازد و جانباز ندارد

در زمرۂ اقوام جہاں نیست شمارش
وندر نگہِ خویش ہم اعزاز ندارد

کم خور و کم گو و کم آمیز باش
تا بیابی سرِّ حق شب خیز باش

شکوۂ دارم از عطا من
عاشق و بر لبش فغانہا

آخر میں خان موصوف کی ان ساری غزلوں سے صرفِ نظر کر کے کہ جن میں انتہائی سنگلاخ زمینوں میں گلزار کھلائے ہیں اور اس طرح طباعی اور مضمون آفرینی کے ساتھ قادر الکلامی کا کمال دکھایا ہے، صرف ایک غزل نمونے کے طور پر پیش کرنا چاہوں گا۔

گفتم، صنمی یا قمری، گفت کہ ہر دو
حورِ اپسری یا بشری، گفت کہ ہر دو
گفتم، رخِ خوب و لبِ لعلِ رواں بخش
گلبرگِ تری یا شکری، گفت کہ ہر دو
گفتم، دُرِ یکدانۂ دریائے جمالی
یا چوں سخنِ من گہری، گفت کہ ہر دو
گفتم، شبِ ہجرانِ مرا کوکبِ نوری :
یا شامِ غم را سحری، گفت کہ ہر دو
گفتم، کہ تو چوں مصرعِ من گوہرِ نابی!
یا قطرۂ خونِ جگری، گفت کہ ہر دو

www.IqbalCyberLibrary.Net ©2002-2006

گفتم، ز بنارس پسرِ برہمن ہستی
یا شاہدِ ملک تبتی، گفت کہ ہر دو
گفتم، کہ تو غلمان پری روئے بہشتی
یا مغبچۂ سیم بری، گفت کہ ہر دو
گفتم، کہ عطاؔ تو ہدفِ تیرِ بلائی!
یا تیغِ غمش را سپری، گفت کہ ہر دو

---

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

گوشۂ اقبال میں ۱۹۸۸ء کے اقبالیاتی ادب کا اضافہ

۱۔ اقبال، سر محمد ابتدائی کلامِ اقبال بہ ترتیب مہ و سال، مرتبہ گیان چند۔ کراچی ۳۲: شائستہ پبلشنگ ہاؤس پوسٹ بکس ۱۵۰۲۵۔ صدر۔ ۱۹۸۸۔ ص ۴۵۹+۱۴، قیمت ۱۸۰ روپے

۲۔ اقبال، سر محمد۔ پیر و مرید: علامہ اقبال اور مولانا ندوی کا مکالمہ: شرح از محمد شریف بقاء لاہور: مکتبہ تعمیرِ انسانیت اردو بازار۔ ۱۹۸۸، ص ۱۷۶۔ قیمت ۳۰ روپے

۳۔ آغا اشرف: اقبال اور پاکستان۔ لاہور: نذیر سنز پبلشرز۔ ۴۰۔۱ اے اردو بازار ۱۹۸۸۔ ص ۱۳۶، قیمت ۳۰ روپے

۴۔ انور، ڈاکٹر عشرت حسن۔ اقبال کی مابعد الطبیعیات۔ لاہور: اقبال اکادمی پاکستان ۱۱۶۔ میکلوڈ روڈ۔ ۱۹۸۸۔ ص ۱۵۶، قیمت ۵۰ روپے

۵۔ انور سدید، ڈاکٹر۔ اقبال کے کلاسیکی نقوش۔ لاہور: اقبال اکادمی پاکستان۔ ۱۱۶ میکلوڈ روڈ ۱۹۸۸۔ ص ۲۰۲، قیمت ۵۰ روپے

۶۔ بزمِ اقبال (۱ مرتب)۔ منشوراتِ اقبال۔ لاہور: بزمِ اقبال ۲ کلب روڈ۔ ۱۹۸۸، ص ۱۳۶ قیمت ۲۵ روپے

۷۔ تاثیر، محمد دین۔ اقبال کا فکر و فن، مرتبہ افضل حق قرشی۔ لاہور: یونیورسل بکس۔ ۴۰۔۱ اے اردو بازار۔ ۱۹۸۸، ص ۲۴۰، قیمت ۶۰ روپے

۸۔ حسن اختر، ملک ڈاکٹر۔ اقبال اور نیٹشے، لاہور: نذیر سنز پبلشرز، ۴۰۔۱ اے اردو بازار ۱۹۸۸۔ ص ۱۱۲۔ قیمت ۲۵ روپے

۹۔ حسن اختر، ملک ڈاکٹر۔ اقبال ایک تحقیقی مطالعہ، لاہور: یونیورسل بکس، ۴۰۔۱ اے اردو بازار، ۱۹۸۸، ص ۲۴۸۔ قیمت ۶۰ روپے

۱۰۔ حق نواز، پروفیسر۔ اقبال ایوانِ اسمبلی میں۔ لاہور: یونیورسل بکس، ۴۰۔۱ اے اردو بازار ۱۹۸۸۔ ص ۱۲۶۔ قیمت ۳۶ روپے

۱۱۔ خان، عبدالرحمٰن۔ علامہ اقبال کی کردار کشی۔ ملتان: جاوید اکیڈمی چیمبک۔ ۱۹۸۸۔ ص ۱۸۴۔ قیمت ۳۰ روپے